ڈاکٹر زیب النساء
لیکچرار (پنجابی)، شعبہ پاکستانی زبانیں، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد۔

میر تنہا یوسفی کی پنجابی شاعری: تنقیدی جائزہ

Dr. Zaib-Un-Nisa
Lecturer (Punjabi, Department of Pakistani Languages, AIOU, Islamabad.

Critical Analysis of Punjabi Poetry of Mir Tanha Yousafi

Mir Tanha Yousafi is an eminent author of Punjabi and Urdu language. Although he is a great fiction writer but he has also made a contribution towards poetry. He has composed Punjabi Ghazal and Nazam. His poetic work in Punjabi language "Keekar Nu Pach" published in 2016 which is still not analyzed by any researcher or critic. His Punjabi poetry is a beautiful amalgam of poetic art, thought and form. He has presented a very realistic picture of modern society. He strikes us though his poetry that our society is astoundingly selfish, insensible and hard – hearted. Moreover, he has practiced many Punjabi poetic genres in this creation. In this research article an attempt has been made to analyze his genres, themes, diction, allusions and other literary devices with suitable references from the text.

Key Words: *Mir Tanha Yousafi, Punjabi, Poetry, Themes, Diction, Allusions, society.*

ادبا اور شعرا ہمارے سماج کا وہ حساس طبقہ ہوتے ہیں جو اپنی بصیرت کو بروئے کار لا کر اپنے ارد گرد وقوع پذیر ہونے والے حالات و واقعات کو اپنی تخلیقات میں سمو کر ایک مستند تاریخ مرتب کرتے ہیں۔ یوں ان تخلیقات کے ذریعے تاریخ کے حقائق مسخ ہونے سے محفوظ رہتے ہیں۔ یہ طبقہ اپنے عہد کے سیاسی، سماجی، معاشی و ثقافتی منظر نامے کو کبھی شاعری کے ذریعے اور کبھی نثر نگاری کے ذریعے سامنے لاتا ہے۔ ایسے ہی ایک ادیب اور شاعر میر تنہا یوسفی ہیں۔ شاعر مشرق کی دھرتی پر جنم لینے والی اس شخصیت کی کئی پرتیں ہیں۔ وہ بیک وقت اردو اور پنجابی کے شاعر، کہانی کار اور ناول نگار ہیں۔ نثر نگاری ان کا خاص میدان ہے اور پنجابی ناول نگاری ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ انھوں نے پنجابی زبان میں پانچ ناول اور دو کہانیوں کے مجموعے تخلیق کیے۔ ان کی تخلیقات کو مشرقی پنجاب (انڈیا) میں

گرمکھی رسم الخط میں بھی ڈھالا گیا اور ان کا ایک ناول "ایک سمندر پار" گرونانک دیویونیورسٹی امرتسر کے ایم۔اے (پنجابی) کے کورس میں شامل کیا گیا لیکن وہ کہتے ہیں کہ "اوہناں نوں نثر نگار گھٹ تے شاعر وڈا منیا جائے۔"(۱)

اس کا کارن وہ یہ بتاتے ہیں کہ ان کی شاعری مقدار کے لحاظ سے نثر نگاری سے کہیں کم ہے لہٰذا وہ بڑے شاعر ہیں۔ مختلف جامعات میں ان پر ہونے والی تحقیقات میں بھی ابھی تک ان کے فن نثر نگاری کو موضوع بحث بنایا گیا ہے اور اکادمی ادبیات پاکستان کی شائع کردہ اہل قلم کی ڈائریکٹری میں بھی ان کی پنجابی شاعری کا ذکر موجود نہیں ہے۔ یوں اس ہمہ جہت ادبی شخصیت کا یہ پہلو لمحہ موجود تک تشنہ ہے اس لیے اس تحقیقی کام میں ان کی پنجابی شاعری کا تنقیدی جائزہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

میر تنہا یوسفی کی پنجابی شاعری کا مجموعہ "ککر نوں پچھ" کے نام سے سانجھ پبلی کیشنز لاہور نے ۲۰۱۶ء میں شائع کیا۔ ایک سو بانوے صفحات پر مشتمل اس تخلیق میں ان کی پینسٹھ غزلیں اور پچاس نظمیں شامل ہیں۔ صفحہ نمبر ۶۵ سے نظموں کا آغاز ہوتا ہے جن میں پنجابی کی ہر دلعزیز لوک صنف "بولیاں" اور ماہیا بھی شامل ہیں۔

"ککر نوں پچھ" کی ورق گردانی کرتے ہوئے لاشعور میں چھپا ہوا علامہ اقبال کا یہ قول ذہن میں ابھر آیا کہ جہاں بھی کوئی اچھا شعر پاؤ تو سمجھو کہ کوئی مسیحا نفس مصلوب ہوا ہے۔ اس ضمن میں یوسفی صاحب کی غزل کے یہ اشعار ملاحظہ کریں:

اوہناں مڑ نہ اپنی جان دے جان دی سوچی
جہناں تیز ہوا نوں رسے پان دی سوچی
جہنے سوچی بات انوکھی جگ توں وکھری
جگ نے اوہنوں چھل دی پھاہی لان دی سوچی
ڈر دے مارے لوکی گونگے ہو کے بہہ گئے
میں فر اٹھیا، اٹھ کے رولا پان دی سوچی(۲)

میر تنہا یوسفی عصر حاضر کی تمام جزئیات چشم عمیق سے مشاہدہ کرنے والے باشعور شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں آج کا یہ عہد اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ آپ کی شاعری میں جدید انسان کا کرب پوری شدت کے ساتھ موجود ہے۔ یوں ان کی شاعری اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ تخلیق کے لمحات میں انہیں

شدید کرب تصلیب سے واسطہ پڑا ہو گا۔ آپ اس عہد جدید کے نظریہ فن و ضرورت پر اعتقاد نہیں رکھتے۔ آپ کی شاعری حق و سچ کی خاطر تختہ دار پر چڑھنے کا درس دیتی ہے اور یہ جرات مندانہ سبق وہ ہی دے سکتا ہے جس کا قلم کسے کے آگے جھکتا نہیں۔ سماج میں ہونے والی ناانصافیوں، جابرانہ سلوک، عزتوں کی پامالی اور کمزوروں کے حقوق سلب ہوتا دیکھ کر آپ کا قلم لہو اگلتا ہے:

بھیڑے ویلے جد نہ آئے ٹالنے
اڈ گئے پنچھی ، ڈگ پئے سکھنے آلھنے
خورے کنّے سال نیں پچھے جوگ دے
خورے کنّے جفر نیں جالنے(۳)

ان کی غزل محبوب کے حسن و عشق کو بیان تو کرتی ہے لیکن غم دوراں کا بیان مشتاق احمد یوسفی کی غزل کا مرکزی موضوع ہے۔ وہ ایک حساس، باشعور شاعر ہیں۔ ان کی شاعری محض رومانوی یاد آفرینی پر مبنی نہیں۔ ان کی شاعری میں "جفر جالنے" اور "جوگ" کا ذکر پرانے سوالات کے جدید سیاق و سباق کو جنم دیتا، حیات و کائنات کے مسائل کو اپنے اندر سموتا ہے۔ وہ پرانے موضوعات کو نئے اسلوب میں ڈھال کر فن و فکر کے نئے دریچوں سے متعارف کراتے ہیں۔ سماجی انتشار، بے سمتی، بے گھری، بے مقصدی و لاحاصلی اور ذات کی تلاش جیسے موضوعات کو بیان کرتی ان کی شاعری قارئین کے دل و ذہن کو جھنجھوڑنے کا سبب بنتی ہے:

دھپاں جر جر جہڑا کوٹھا چھتیا سی
پہلی و اچھڑ نال ای چوون لگ پیا اے
کسے نیں مڑ کے نہیں پچھنا سمجھایا سی
تنہا فیر ایہ حرف پروون لگ پیا اے(۴)

آج کے شاعر کا یہ المیہ ہے کہ اس نے میکانکی دور میں آنکھ کھولی جب سائنس کے پراسرار انکشافات نے کائنات میں بے تحاشا تغیر برپا کر دیا اور وہ عناصر جنھیں وہم و گمان کا شاخسانہ قرار دیا جاتا تھا آج حقیقت بن چکے ہیں۔ ناممکنات ممکنات میں بدل چکے ہیں یوں فن و فکر کی کائنات بھی ان انقلابات کی زد میں آ کر سوچ و فکر کے نئے زاویوں

کی متلاشی ہے۔ آج زندگی کے دوسرے میدانوں کی طرح شاعری پر بھی تشکیک کا سایۂ فگن ہے کہ شاعر کا تعلق زمین و آسمان سے کمزور ہوتا جارہا ہے اور جب یہ تشکیکی عمل شروع ہوتا ہے تو پھر کسی بارے میں کوئی بات یقین سے نہیں کی جاسکتی۔ اس بارے میں ڈاکٹر ممتاز الحق یوں رقم طراز ہیں:

"نئی شاعری نے بے معنی روایات سے اپنا دامن بڑی حد تک چھڑا لیا ہے۔ اپنی ذات کے انکشاف نے نئے شاعر کو جہاں ایک طرف حقیقت پسند بنا دیا ہے۔ وہ روایتی اسلوب اور روایتی مضامین سے بھی منحرف ہوتے چلے گئے ہیں۔"(۵)

نئی شاعری میں احساس تنہائی، ذات کی شکستگی، ذہنی دباؤ اور احساس جرم جا بجا موجود ہے جو کہ اس سائنسی دور کی عنایت ہے۔ اس ماحول کے زیر اثر شاعری بھی جدید خد و خال کے ساتھ رونما ہوئی اور جدید حسیت کی منظر کشی کرنے لگی جیسا کہ مشتاق احمد یوسفی لکھتے ہیں:

کسے دا پاس لحاظ کسے نوں ذرا نہیں رہندا
شہر چ آ کے اک وی بندہ کھرا نہیں رہندا
کہڑے پنڈ وچ کیدو ورگے بھوت نہیں وسدے
ہیر جہیاں پریاں دا کتھے پرا نہیں رہندا
گھر توں بے گھر ہوئے تاں ایہ کھلیا تنہا
کاہنوں رُکھ توں کھوہیا پتر ہرا نہیں رہندا(۶)

جدید شاعری میں شہر ایک استعارہ بن چکا ہے بے حسی و خود غرضی کا، منافقت و دھوکا دہی کا۔ اسی استعارے کو منفی معنی دان کرتے ہوئے یوسفی صاحب نے رموز و علائم کے پردے میں چھپانے کی بجائے کھلے لفظوں میں غزل کی زینت بنا دیا ہے۔ کیدو اور ہیر کے روایتی استعاروں کو روایتی معنوں میں بیان کرتے ہوئے عہد حاضر کے آشوب کا ابھارنا ان کی فنی پختگی کی دلیل ہے جب کہ اسی غزل کے آخری شعر میں وہ جبری ہجرتوں کو موضوع بناتے ہیں۔ صنعتی انقلاب نے جہاں انسان کو بے شمار آسائشیں عطا کیں لیکن اس کے بدلے میں وہ خراج وصول کیا کہ جس نے سنہری اقدار اور روایات کا جنازہ نکال دیا۔ مشترکہ خاندانی نظام جو مشرقی روایت کا حسن تھا، اس کو ختم کیا یوں جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھنے کے لیے یہ جبری ہجرتیں انسان کا مقدر ٹھہریں۔ انہی ہجرتوں کی

اذیت یوسفی صاحب کے دل وروح پر گھاؤ لگا گئی تو وہ پکار اٹھے:

توں جگ بیتی دی کرنا ایں ، میں اپنے ہڈ ہنڈائیاں نیں
اس راہ وچ کدھرے مارو تھل تے کدھرے اتھیاں کھائیاں نیں
توں کہڑی دنیا وَسنا ایں ، کیہ ویکھ کے کھڑ کھڑ ہسنا ایں
ہر اک دے پلے اتھرونیں ، ہر اک دے کول جدائیاں نیں
دل او سے پنڈ وچ رہندا اے ، ایہ اوتھے ای اٹھدا بہندا اے
جس پنڈ دیاں گلیاں اج تنہا سجناں دے باہجھ پرائیاں نیں(۷)

نئی راہوں کا متلاشی انسان جب اپنوں کی کھوج میں پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے تو محض ماضی کی پر چھائیاں نظر آتیں ہیں پھر عہد گم گشتہ کو زمانہ حال میں بدلنا ایک ایسی ناآسودہ خواہش جنم لیتی ہے جو انسان کی لوں لوں میں سما کر اس کو کچو کے لگاتی ہے۔ احساس زیاں حاصلات زندگی پر غالب آ کے اس کی روح تک میں چھید کر دیتا ہے اور آسودہ زندگی کا خواب ڈراؤنی حقیقت میں بدل جاتا ہے:

جہنے کہنے بھورا چانن منگیا سی
ٹھیرے اوہنوں سولی اُتے ٹنگیا سی
مینوں پک اے بے پروا نوں بھل گیا اے
اوہنے مینوں کہڑے رنگ وچ رنگیا سی
میریاں گلاں زہری ہندیاں جاندیاں نیں
مینوں اوہدیاں گلاں ایویں ڈنگیا سی(۸)

معلوم سے نامعلوم اور پھر معلوم کے سفر ناتمام میں یوسفی صاحب اپنے تخلیقی سفر پر رواں دواں رہتے ہیں لیکن ان صعوبتوں کا زہر ان کے رگ و پے میں اتر کر ان کی شاعری میں کڑواہٹ گھولتا انھیں ماضی کی جانب کشش کرتا ہے پھر ماضی کے سنہرے ماہ و سال سے وہ اپنی شاعری کے تانے بانے بنتے ہیں:

گلاں کر دی اکھ مستانی کتھے گئی!
کوٹھے ٹپنے مست جوانی کتھے گئی؟
کھلکے خورے کیہ ہونا ایں ، چھڈ پرانہہ
ایہہ دس! کل دی پریم کہانی کتھے گئی؟
اوہدے ناں دے ماہیئے گاون والے دی
ہتھ دی ونجھلی ، گل دی گانی کتھے گئی (۹)

اقدار کی شکست و ریخت سے پریشان انسان ماضی کے جھروکوں میں پناہ لیتا آرزو مند ہے کہ ماضی کی طرح حال اور اس کا آنے والا کل بھی تابناک ہو۔

اگر یوسفی صاحب کی نظموں کی بات کی جائے تو ان کی نظموں میں غم دوراں کے ساتھ ساتھ لوک رنگ اور صوفیانہ خیالات غالب ہیں۔ ان کی نظموں کا آغاز ایک حمدیہ نظم "سائیں" سے ہوتا ہے:

آ دل دے بیلے آ سائیں
ایہہ بیلا تین بن سنجا ہے
آ آ کے میلے لا سائیں
ہن تیتھوں کاہدی سنگ سائیں
آ بیٹھی تیرے بوہے تے
توں رنگ لے اپنے رنگ سائیں (۱۰)

اس حمد میں شاہ حسین والا بے باک و بے تکلف انداز غالب ہے۔ وہ خالق کائنات کے حضور روایتی حمد و ثنا سے گریز کرتے اپنا حال دل بیان کرتے ہیں۔ عشق حقیقی کو مجازی رنگ میں ڈھالتے روح کی تاروں کو ہلا دیتے ہیں۔

حمد کے بعد ان کے اس مجموعے میں نعت شامل ہے۔ آزاد نظم کی ہیئت میں لکھی گئی اس نعت میں ان کا جذبہ عقیدت نرالا انداز لیے ہے:

مہک تے چانن دا ایہ تانا بانا ہندا
نہ دن چڑھدا، شام نہ ڈھلدی
ایہ سورج ایہ چین نہ ہوندے
نہ ای کالے بدل ورہدے
نہ ست رنگی پینگ ای پیندی
پرے دی مست ہوا نہ چلدی
کائنات دی ہستی مستی
آدم زاد دی وسدی وستی
کجھ نہ ہندا
چار چفیرے
بس اک سن جہیا ویرانہ ہندا
آپ دا جیکر جگ اُتے نہ آنا ہندا(۱۱)

نعت کے بعد منقبت شامل کی گئی ہے۔ "اکھڑ مکھڑے" کے نام سے سی حرفی کی ہیئت میں لکھی نظم میں روحانی تجربات کا بیان صوفی واردات کا عکاس ہے:

پ　پت جھڑ دی رت نہ آوے ، کنکاں کیویں ہون
جے ککر نوں پچھ نہ لگن ، گونداں کتھوں چون
پھ　پھندے دی پینگھ دا جھوٹا ، لے گئے سچے یار
ساڈے ورگے جوٹھے ، رہ تکدے پہاں بھار
ت　تکن جوگے جد ہوئے ، دنیا لگی ہور
پہلاں سی ایہ ہیر دا بیلا فیر ہوئی بھنبھور(۱۲)

بابا فریدؒ سے لے کر خواجہ فریدؒ تک کی پنجابی شاعری میں تصوف کی ایک بھرپور شاندار روایت موجود ہے۔ یوسفی صاحب کی نظموں کا تجزیہ کیا جائے تو بجا طور پر وہ اس روایت کے تسلسل کو آگے بڑھاتے دکھائی دیتے

ہیں۔ ان کی نظموں میں شاہ حسین والا نڈر اور بے تکلف طرز تکلم جا بجا ملتا ہے جو ان کی اس صوفی شاعر سے وابستگی کا پتا دیتا ہے۔ ان کی ایک نظم "شاہ حسین دی دھمال" کا ایک بند ملاحظہ ہو جس میں وہ شاہ حسین کی مشہور کافی 'اندر توں ایں، باہر توں ایں، روم روم وچ توں" والی فکر کو آج کے قارئین تک پہنچاتے ہیں:

ڈھول ڈغے تے نچ او تنہا ڈھول ڈغے تے نچ
یار ہے اندر ، یار ہے باہر ، یار ترا ہر تھاں
لوکی تینوں واجاں مارن لے لے اوہدا ناں
اوہدا رنگ گیا اے تیرے انگ انگ دے وچ رچ
ڈھول دغے تے نچ او تنہا ڈھول ڈغے تے نچ(۱۳)

سیف علی یوسفی صاحب کی اس نظم کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے لکھتے ہیں:

"یوسفی ہوراں دی پنجابی نظم دی اپنی بنت تے اپنا نظام اے۔ اوہ روح دیاں گلاں کر دے نیں تے اپنا دکھڑا کھول کے ساڈے سامنے رکھدے نیں۔ انج یوسفی دا دکھ ساریاں روحاں دا دکھ بن جاندا ہے۔
سو سو واری نہاتے دھوتے، وچوں فیر وی گندے، اوہناں دی اک نظم 'ربا تیرے بندے' دی پہلی لائن اے۔ ایہ مصرع ای پوری نظم جاپدا اے۔ فیر وی باقی نظم وچ اوہ سماج دے ایہو جئے ہور بندیاں دا ذکر کر دے ہوئے آخر اس نتیجے تے اپڑے نیں پئی،
توں اک برابر کر دے کیہ چنگے، کیہ مندے"(۱۴)

یوسفی صاحب تصوف کی اس راہ مسافر دکھائی دیتے ہیں جہاں پہنچ کر منصور حلاج اناالحق پکار اٹھے تھے اور شاہ حسین نے داڑھی مونچھ منڈوا کر جنگل، بیلوں میں پناہ لے لی تھی۔ وحدت الوجود یا ہمہ اوست کے اسرار و رموز سے شناسائی کی جھلک ان کی اس نظم میں واضح طور پر محسوس کی جا سکتی ہے۔ حقیقت شناسی کی دولت سے اپنا دامن لبریز رکھتے ہوئے بھی وہ انسانی وجود کی کمیوں اور کوتاہیوں سے نالاں اپنے رب سے شکوہ کناں ہیں:

اک پاسے نیں محل مسیتاں ، اک پاسے نیں چندے
ربا تیرے بندے
"میں ای سچ آں" آکھن والے گل وچ پاون پھندے
ربا تیرے بندے
گنجھلاں مارے ٹٹے دھاگے پاون کھڑی تندے
ربا تیرے بندے
تیتھوں وی نہ اک جہے ہوئے بھیڑے ، چنگے ، مندے
ربا تیرے بندے (۱۵)

یوسفی صاحب کی شاعری کو موضوعاتی اعتبار سے پرکھا جائے تو مضامین کا ایک لمبا چوڑا سلسلہ نظر آتا ہے۔ کہیں وہ عشق حقیقی کو بیان کرتے ہیں تو کہیں ماہر سماجیات کی طرح سماج کے عیبوں کی پردہ کشی کرتے ہیں۔ کہیں فلسفیانہ رنگ میں عالمگیر حقیقتوں کو شاعری کا جامہ پہنا دیتے ہیں۔ ان کی سوچ کے مختلف زاویوں کو اکٹھا کر لیا جائے تو یہ زندگی کی جامع تصویر بن جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ان کی یہ نظم ''پڑوچ لتھن سے'' کاروان حیات میں جواں مردی کا درس دیتی کامیابی کی نوید سناتی جینے کا حوصلہ بخشتی ہے:

لڑنا وی اے
بچنا وی اے
جتنا وی اے
ہن ایہ جان
لڑائی دے وچکار نہیں دینی (۱۶)

مشتاق احمد یوسفی اس بات سے پوری طرح آگاہ ہیں کہ ہمارے معاشرے میں لوگ نام نہاد اناؤں کی خاطر ذاتی مفاد کو ملکی و سماجی مفاد پر ترجیح دیتے ہیں۔ معاشرے کے یہ ناسور لمحاتی شہرت کی خاطر سود وزیاں سے بے نیاز اپنے نفس امارہ کی تسکین کے لیے ہر طرح کا کام کر گزرتے ہیں:

اک بندا
ہر اک موڑ تے
اپنا بت سجاون لئی
اوہ تے سارا
شہر ادھیڑ کے بہہ گیا اے (۱۷)

موضوعات کی طرح یوسفی صاحب کی شاعری بھی مختلف اصناف کی اوڑھنی اوڑھے ہوئے ہے۔ ان کی نظم کہیں سی حرفی کی صنف میں ہے تو کہیں باراں ماہ کا رنگ غالب ہے۔ کہیں لوک اصناف کی جھلک ہے تو کہیں نظم پر غزل اور غزل پر نظم کا گمان گزرتا ہے۔ مثال کے طور پر "امر کتھا" کے یہ اشعار دیکھیں:

توں رنگ سنہرا پوجیا تے ٹریوں نال ہوا
میں ہجر سمے دی چاننی ، میں وسری ہوئی راہ
میں کوک فراق دی رات دی ، اکلاپے دی کرلاٹ
میں موہرا انج دا پی لیا نہیں لبھدی جھدی کاٹ (۱۸)

ڈاکٹر یوسف حسین خاں نظم اور غزل کے ان باہم اثرات پر اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

"ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو پچھلے پچیس تیس سال میں غزل نے نظم پر اور نظم نے غزل پر اپنا اثر ڈالا ہے۔ غزل کی ریزہ کاری اگرچہ حقیقت میں کوئی عیب نہیں لیکن پھر بھی یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ جدید زمانے کی زندگی کا رجحان کلام میں تسلسل کا متوقع رہتا ہے۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ غزل میں ایک قسم کا تسلسل پیدا کیا جائے گا اور منفرد شعروں کے پس منظر میں وحدت احساس کی کارفرمائیاں بڑھتی جائیں گی اور اس کے ساتھ ساتھ نظم بھی اپنے اندر رمز و کنایہ اور موسیقیت کے ذریعے تغزل کی صفات پیدا کرنے کی کوشش کرے گی اور اس طرح دونوں اصناف ایک دوسرے کے قریب آجائیں گی۔" (۱۹)

یوسفی صاحب کی غزلوں میں کہیں کہیں فکر کا تسلسل ملتا ہے تو نظموں میں ہجر و فراق جیسے غزل کے

روایتی موضوع کی گونج نظم اور غزل کے ملاپ کا اشارہ ہے۔ یہاں فکر غزل سے مستعار لی گئی ہے جب کہ ہیئت پابند نظم کی ہے۔ یوسفی صاحب نے پابند نظم کے ساتھ ساتھ آزاد نظم کو بھی تختہ مشق بنایا ہے۔ ماہیا پنجابی لوک شاعری کی ایک ہر دلعزیز صنف ہے۔ "پولے مونہہ" کے نام سے یہ نظم ماہیا کی روایتی ہیئت میں لکھی گئی ہے:

چل　　مکدی　　مکا　　ماہیا
دفع　　کر　　دنیا　　نوں
توں　　میرے　　نال　　آ　　ماہیا (۲۰)

اسی طرح ایک مصرعے پر مشتمل لوک صنف "بولیاں" میں بھی یوسفی صاحب نے طبع آزمائی کی ہے۔ اس صنف کے بارے میں سید احمد ندیم قاسمی لکھتے ہیں:

"بولی اشاریت اور دل آویز ابہام کی انتہا ہے۔ دو تین لفظوں میں پورا واقعہ، مکمل تجربہ اور طویل قصہ سمٹ آتا ہے اور لطف یہ ہے کہ یہ اشارے سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔"(۲۱)

بولی جیسی ہمہ گیر، جامع، موثر اور گھمبیر صنف میں لکھنا کہ جس میں مواد، ہیئت اور فکر کو چند الفاظ میں سمیٹ دیا جاتا ہے، یوسفی صاحب کا کمال فن ہے۔ ان کے اس فن کی چند جھلکیاں دیکھیں:

اساں انکھاں دی کھیڈ رچائی تے بیلیاں نے پج لبھ لئے
جھبڑی ریت اتے لکھی سی کہانی ، ورولیاں دے ہتھ لگ گئی
اوہنوں سفنے دی بات سنائی ، اوہ ہس ہس دوہرا ہو گیا (۲۲)

اسی حوالے سے میر تنہا یوسفی صاحب کی شاعری کا تجزیہ کیا جائے تو نتیجہ نکلتا ہے کہ انھوں نے تشبیہات و استعارات اپنی ثقافت سے اخذ کی ہیں یوں بستر مرگ پر پڑی پنجابی ثقافت ان کی شاعری کا حسن چمکا دیتی ہے، مثلاً:

ٹرپئی　سجناں　نال　تے　سکھیاں　رہ　گئیاں
امبیاں　ادھ　پچدھیاں　چکھیاں　رہ　گئیاں
سوہنے　پھڑ　لئی　بانہہ　ترنجن　وچ　آ　کے

چرخا، پونیاں، اٹیاں رہ گئیاں (۲۳)

یوسفی صاحب نے رومانوی قصوں کو بطور تلمیح اپنی شاعری میں استعمال کیا ہے۔ وہ ہیر رانجھا، سسی پنوں، سوہنی مہینوال اور مرزاں صاحباں جیسے رومانوی قصوں کی تلمیحات کو نئے معنے دان کرتے ہیں اور ان کو حالات حاضرہ سے ہم آہنگ کر کے اپنی شاعری کو فکر و فن کا متزاج بخشتے ہیں:

کجھ ہیر جیہیاں تے کلیاں سن ، کجھ سوہنی وانگوں جھلیاں سن
کجھ سسیاں خاک چ رلیاں سن نہیں قسمت اتے زور سجن (۲۴)

اس شعر میں ہیر، سوہنی اور سسی کی تلمیح برتی گئی ہے۔ اسی طرح انھوں نے اپنی نظم "اکوسٹا" میں شیریں، فرہاد، ہیر اور لیلیٰ مجنوں کی تلمیح کو نئے معنی دیئے ہیں۔

صنعت تکرار لفظی کو استعمال کرتے ہوئے وہ آج کے انسان کا اپنی دھرتی سے تعلق ٹوٹنا یوں بیان کرتے ہیں:

ساڈے باہجھوں سکدی سکدی سک گئی اے
پنڈوں باہر لی نم جو ساڈے ہان دی سی (۲۵)

اسی طرح زندگی کا عارضی پن بیان کرنے کے لیے صنعت تکرار لفظی سے خوب فائدہ اٹھاتے ہیں:

پینڈا عمراں نالوں لما ، ساہ نیں اکھڑے اکھڑے
کہنوں دسیئے دکھڑے
اک اک کر کے ڈب گئے تنہا ، سورج چن جہے مکھڑے
کہنو دسیئے دکھڑے (۲۶)

یوسفی صاحب اپنی نظم "مکھن" میں صنعت جمع اور صنعت تضاد کا استعمال انتہائی چابکدستی سے کرتے ہیں:

بھانویں کالا کاں کھوویاں پیلاں پاندا مور
راجا ، سنت ، وزیر ، فقیریاں آ کھو ڈاکو چور
پھل ، گلاب تے چنبا سدو بھانویں کنڈا تھور
اوسے نال جینا مرنا ، اوہ ہے گھر ، اوہ گور (۲۷)

یہاں راجا، سنت، وزیر، فقیر اور ڈاکو چور کو ایک جگہ جمع کرنا صنعت جمع کے استعمال میں مہارت ظاہر کرتا ہے۔ جبکہ تیسرے مصرعے میں بھی اسی صنعت کا استعمال اپنی چھب دکھلا رہا ہے۔ چوتھے مصرعے میں جینا مرنا صنعت تضاد ہے۔

انھوں نے اپنے کلام میں یک لفظی، ردیف، دو لفظی اور سہ لفظی ردیف استعمال کی ہے:

یک لفظی ردیف:

مڑ اوس تکیا ، دل نے چکی اتّ نروئی
مڑ ایس دنیا سانوں دتی مت نروئی
منہ چک چک جد گولھاں تکن بال ایانے
بڈھے بوڑھ نوں پھٹ پینیدی اے جت نروئی (۲۸)

دو لفظی ردیف:

اوسے ویڑھے ٹورنی مائے
جتھے دل دا چورنی مائے
نہ اوہ لنگھدا بوہے اگوں
نہ پیندا انج شور نی مائے (۲۹)

سہ لفظی ردیف:

ڈروٹ کے انج بیٹھے رہن دا فیدا کیہ اے
سمجھ رہیا یں نا! میرے کہن دا فیدا کیہ اے
جے ریتے دی ڈانجھ مکان دے کم نہیں آئوندا
فیر دریا دے شوکرے ویہن دا فیدا کیہ اے (۳۰)

اس کے علاوہ انھوں نے بغیر ردیف کے بھی غزلیں لکھیں ہیں۔ مثال کے طور پر چھوٹی بحر کی ایک غزل کے اشعار دیکھیں:

غیراں سو ہار تکیا
واہ صبراں دے میوے
آکھیں تے اٹھ جایئے
بہہ گئے بھل بھلیوے (۳۱)

میر تنہا یوسفی صاحب کہیں کہیں استفہامیہ انداز کو استعمال کر کے اپنی شاعری کا حسن چمکاتے ہیں:

نہ پہنی ہیٹھ ایہ تردا تے کیہ سی
ایہ ہنجو انج نہ مردا تے کیہ سی
توں اپنی وار بھانویں جت ای جاندا
میں اپنی وار نہ ہردا تے کیہ سی (۳۲)

میر تنہا یوسفی صاحب کی زبان زیادہ تر سادہ ہے۔ وہ روز مرہ الفاظ کا استعمال کر کے اپنی شاعری کو عام فہم بناتے ہیں لیکن موقع محل کے مطابق کہیں کہیں مشکل اور دقیق الفاظ کو مہارت سے اس طرح استعمال کرتے ہیں کہ کلام کی روانی بر قرار رہتی ہے:

موہ دے پیر پڑ چن سولاں ، روپ دے گل وچ گٹے
کسے نے سجن سینے لائے ، کسے نے اگ وچ سٹے

کدھرے کوئی راہ پیا بھالے تانگھاں دے جنگل وچ
ایس اک پل وچ بھکیا لوکا ! ایس اک پل وچ (۳۳)

اس ساری بحث کا ماحصل یہ ہے کہ میر تنہا یوسفی صاحب شاعری کی ہر صنف اور فنی لوازمات سے کماحقہ واقف ہیں۔ انھوں نے شاعری کی مختلف اصناف میں کام کر کے اپنے کلام کو اسلوبیاتی تنوع بخش کر منفرد اور دل آویز بنانے کی کوشش کی ہے۔ آپ الفاظ کو قرینے سے برتنے کے ہنر سے بخوبی آگاہ ہیں۔ اپنے بے باکانہ انداز سے فکر کو شاعری میں ڈھالنے والے اس شاعر نے قارئین میں مقصدیت، حقیقت شناسی اور نئی امنگوں کا دیا جلایا ہے۔ معنوی تہ داری، ٹھیٹھ پنجابی الفاظ اور لامتناہی تصورات سے پھوٹتی ان کی شاعری نئے اسلوب کی ضامن ہے۔ ان کے پاس شاعرانہ تجربات کی بہتات اور موضوعات کی رنگا رنگی ثابت کرتی ہے کہ آپ منفرد لب و لہجے کے شاعر ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ میر تنہا یوسفی، ککر نوں پچھ، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۶ء، ص:۷

۲۔ ایضاً، ص ۹۵

۳۔ ایضاً، ص ۳۸

۴۔ ایضاً، ص ۴۷

۵۔ ممتاز الحق، ڈاکٹر، جدید غزل کا فنی سیاسی و سماجی مطالعہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، اشاعت دوم، ۲۰۰۴ء، ص ۲۱

۶۔ میر تنہا یوسفی، ککر نوں پچھ،، ص ۴۳۔۴۲

۷۔ ایضاً، ص ۳۱۔۳۰

۸۔ ایضاً، ص ۶۵

۹۔ ایضاً، ص ۱۰۴

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۰۷

۱۱۔ ایضاً، ص ۱۰۹۔۱۰۸

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۱۳۔۱۱۴

۱۳۔ ایضاً، ص ۱۱۳۔۱۱۴
۱۴۔ سیف علی، جد کگر نو لگے پچھ (دیباچہ)، ص ۸
۱۵۔ ایضاً، ص ۱۳۱
۱۶۔ ایضاً، ص ۱۸۴
۱۷۔ ایضاً، ص ۱۸۵
۱۸۔ ایضاً، ص ۱۴۵
۱۹۔ یوسف حسین خاں، اردو غزل، القمر پرنٹرز، اردو بازار، لاہور، س ن، ص۱۶۔۱۵
۲۰۔ میر تنہا یوسفی، کگر نوں پچھ،، ص ۱۶۴
۲۱۔ رفیق خاور، پاکستان کے عوامی گیت، کراچی، ۱۹۶۴ء، ص ۱۶۹
۲۲۔ میر تنہا یوسفی، کگر نوں پچھ،، ص ۱۸۲
۲۳۔ ایضاً، ص ۳۳
۲۴۔ ایضاً، ص ۲۴
۲۵۔ ایضاً، ص ۶۸
۲۶۔ ایضاً، ص ۱۳۰
۲۷۔ ایضاً، ص ۱۷۹
۲۸۔ ایضاً، ص ۴۰
۲۹۔ ایضاً، ص ۵۴
۳۰۔ ایضاً، ص ۸۹
۳۱۔ ایضاً، ص ۹۱
۳۲۔ ایضاً، ص ۷۸
۳۳۔ ایضاً، ص ۱۲۳